© rasailojaraid.com

مشرق وسطیٰ میں
حقوق انسانی و جمہوریت کا فروغ ــ حقیقت پسندانہ رویہ

ڈیوڈ جی کبل*

تلخیص: فخرالاسلام

اس مضمون میں مشرق وسطیٰ کے ممالک میں انسانی حقوق اور جمہوریت کے حوالے سے تین تجاویز کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ پہلی تجویز برطانوی محکمہ دفاع کی طرف سے پیش کی گئی ہے جس کے مطابق مغربی ممالک کو مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ اس علاقے میں بحالیٔ جمہوریت کی کوششوں کی حوصلہ افزائی کے بجائے بادشاہتوں اور status quo کی حمایت کریں۔ دوسری تجویز پروفیسر فریڈ ہالیڈے (Prof. Fred Halliday) کی ہے جنہوں نے مغرب سے کہا ہے کہ وہ خطے میں جمہوری اصلاحات کی کوششوں میں تحاریک اسلامی سے فاصلہ رکھیں۔ تیسری تجویز برطانیہ کی لیبر حکومت کی جانب سے ان ممالک کو اسلحہ کی فروخت کی ممانعت کی صورت میں سامنے آئی ہے جس کے مطابق ان ممالک کو اسلحہ کی برامد روک لی جائے گی جہاں یہ اسلحہ جمہوریت پسندوں کو دبانے کے لیے استعمال ہوتا ہو۔

مشرق وسطیٰ میں جمہوریت اور انسانی حقوق

مشرق وسطیٰ میں انسانی حقوق کی حالت ناگفتہ بہ ہے اس ضمن میں سعودی عرب میں حقوق انسانی کی پامالی کے حوالے سے ایمنسٹی انٹرنیشنل کی رپورٹوں پر نظر ڈالی جائے تو سعودی جیلوں میں ایذارسانی کے مسلسل واقعات سامنے آتے ہیں۔ ان رپورٹوں میں اسلامی سزاؤں کی جو تفصیل پیش کی گئی ہے اس کے مطابق ۱۹۹۵ء میں ۱۱۱ افراد کو ۲۰۰ تا ۱۵۰۰ تک کوڑوں کی سزا دی گئی۔ ایک مصری باشندے کو ڈاکہ زنی کے مقدمے میں ۴۰۰۰ کوڑوں اور سات سال قید کی سزا سنائی گئی۔ اخباری اطلاعات کے مطابق سعودی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جیل میں قید دو برطانوی خواتین لوسلی میک لیچلن (Lucille Mc Lachlan) اور ڈی بوراہ پری (Deborah Parry) پر تشدد اور مجرمانہ حملے کے الزامات لگائے گئے۔ لندن سے شائع شدہ کتاب ''شہزادی'' میں سعودی خواتین کی حالت زار بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ نہ تو وہ گاڑی چلا سکتی ہیں اور نہ ہی خاوند کی تحریری اجازت کے بغیر سفر کر سکتی ہیں۔ اسی طرح وہ کسی ریستوران میں شوہر، بھائی یا والد کے بغیر کسی اور مرد کے ساتھ کھانا بھی نہیں کھا سکتیں۔ کتاب کے مصنف نے غیر ملکی خواتین کو ملازمت کے حقوق نہ دینے اور ان پر جسمانی اور جنسی تشدد کے واقعات بیان کیے ہیں۔ واضح رہے کہ علاقے کے دوسرے ممالک میں حقوق انسانی کی حالت سعودی عرب جیسی ہے۔

جہاں تک جمہوریت کا تعلق ہے تو علاقے کے ممالک میں مختلف نظام ہائے سیاسی پائے جاتے ہیں جن کے ڈانڈے یا قبائلی نظام اور یا پھر مغربی نو آبادیاتی دور کے بعد کے ادوار سے ملائے جاتے ہیں۔ سطحی طور پر نظر تو یہ آ رہا ہے کہ مشرق وسطیٰ کے ممالک عظیم تر جمہوریت کی جانب گامزن ہیں۔ ۱۹۹۲ء میں شاہ فہد نے ساٹھ رکنی مجلس شوریٰ قائم کی جس کا مقصد لوگوں کے ساتھ مشورے کا عمل شروع کرنا قرار پایا۔ ۱۹۹۷ء میں مجلس کی رکنیت نوے تک بڑھا دی گئی۔ اگرچہ اس کے اختیارات محدود ہیں یعنی یہ صرف ان پالیسیوں پر اظہار رائے کر سکتی ہے جو بادشاہ ان کے سامنے پیش کرے۔ یہ مجلس ان قوانین کی تشریح اور رپورٹس کا تجزیہ بھی کرتی ہے جس کے لیے حکومت کی طرف سے انہیں کہا جائے۔ ہر رکن جو تیس سال سے زائد کی عمر کا ہوتا ہے اسے بادشاہ خود نامزد کرتا ہے اور وہ شوریٰ کا رکن بننے سے پہلے اپنے عقیدے، ملک اور بادشاہ سے وفاداری کا حلف اٹھاتا ہے۔ یہ مجلس اسلام کے اس روایتی عملِ مشورہ (شوریٰ) کا مظہر ہے جس کے تحت حکمران کو عوام الناس سے مشورہ کرنا پڑتا ہے۔ سعودی عرب کی موجودہ حکومت سے عدم اطمینان کی وجہ سے اسلامی بنیاد پرست ابھر کر سامنے آ رہے ہیں۔ حکمرانوں پر جن حوالوں سے تنقید ہو رہی ہے ان میں سماجی اور معاشی مسائل، شاہی خاندان میں بدعنوانیاں اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم جیسے امور شامل ہیں۔

سعودی عرب کے ایک اور ہمسایہ ملک بحرین میں بھی حزب مخالف نے سیاسی اصلاحات کا مطالبہ شروع کر دیا ہے۔ ۱۹۹۴ء سے شیعہ گروہ بطور خاص تبدیلی کے لیے کوشاں ہیں۔ اسی سال دس فیصد افراد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے ایک یادداشت پر دستخط کیے جس میں امیر شیخ عیسیٰ الخلیفہ سے سیاسی اصلاحات بالخصوص ۱۹۷۵ء میں برخاست شدہ قومی اسمبلی کی بحالی کا مطالبہ کیا گیا۔ یاد رہے کہ مذکورہ اسمبلی توڑے جانے کے بعد ملک شاہی فرمان کے ذریعے چلایا جا رہا ہے، اگرچہ امیر کی معاونت کے لیے چالیس رکنی شوریٰ بھی موجود ہے۔ ۱۹۹۶ء میں حزب اللہ بحرین نامی گروہ نے حکومت کا تختہ الٹانے کی ناکام کوشش بھی کی۔

اومان میں اگرچہ تمام کلیدی عہدے یعنی وزارت عظمیٰ، دفاع اور خارجہ امور بادشاہ کے ہاتھ میں ہیں لیکن حالیہ برسوں میں مشاورت اور جمہوریت کی جانب قابل لحاظ پیش رفت ہوئی ہے۔ یہاں پر بھی ایک مجلس شوریٰ قائم ہے مگر سعودی عرب کے برعکس اس کے ارکان محدود حق رائے دہی (limited suffrage) کے تحت منتخب ہوتے ہیں۔ ہر رکن ایک ضلع یا ولایت کا نمائندہ ہوتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ خواتین بھی اس مجلس کی ارکان بن سکتی ہیں۔

اُردن میں بھی جمہوری اصلاحات کے نفاذ کی طرف تدریجی قدم بڑھائے جا رہے ہیں۔ ۱۹۹۳ء میں اُردنی پارلیمان کے انتخابات بالغ رائے دہی کی بنیاد پر کرائے گئے۔ یہ منتخب پارلیمنٹ اگرچہ حکومت پر بہت ہی محدود اختیار رکھتی ہے، تاہم یہ بحث ومباحثے کے لیے ایک اچھا پلیٹ فارم ضرور ہے۔ اُردن میں شاہ حسین (مرحوم) کا تصور جمہوریت فروغ پا رہا ہے جس کے مطابق کثیر الجماعتی نظام کو عرب روایات کے ساتھ ہم آہنگ کرنا مقصود ہے۔

ادھر کویت میں بھی ۱۹۹۱ء کی جنگ خلیج کے بعد قومی اسمبلی کو بحال کیا گیا اگرچہ الصباح خاندان نے رائے دہندگان کے حلقے میں توسیع کا سنہری موقع گنوا دیا۔ موجودہ نظام میں ملک کی کل آبادی (۱۵ لاکھ) میں سے ۶ لاکھ کویتی باشندے ہیں۔ ان چھ لاکھ میں سے تین چوتھائی لوگ ''درجہ اول'' یا آرٹیکل اول'' کے شہری ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے خاندان ۱۹۲۱ء سے کویت میں آباد ہیں۔ درجہ اول خاندانوں کے بالغ افراد (تقریباً ۸۱،۴۰۰) کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہے۔ پچاس رکنی اسمبلی میں ۳۵ ارکان ایسے کامیاب ہوئے ہیں جو حکومت وقت کے سخت نقاد ہیں۔ ان میں ۲۳ ارکان باقاعدہ حزب مخالف، آٹھ آزاد اور چار قبائلی رہنما ہیں۔ ان ۳۵ میں سے بنیاد پرستوں نے ۱۰ نشستیں حاصل کی ہیں جبکہ آٹھ آزاد ارکان بھی ان کے حمایت یافتہ ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس وقت کویت کی منتخب اسمبلی میں بنیاد پرست گروہ اکثریت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں ہے۔ اب یہ مطالبہ زور پکڑتا جارہا ہے کہ اسمبلی کے اختیارات میں اس طرح اضافہ کیا جائے کہ یہ ازخود قوانین کی تدوین کے ساتھ ساتھ حکومتی پالیسی پر اظہار رائے کرسکے۔

بادشاہ، مساجد اور فوجی ساز وسامان

درج بالا سطور میں مشرق وسطیٰ کے مختلف ممالک میں لوگوں کی کاروبار مملکت میں شرکت کی مختلف صورتیں بیان کی گئیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں سے بعض ممالک میں سیاسی جماعتوں پر پابندی ہے جبکہ بعض میں انہیں کام کی آزادی ہے چنانچہ خطے کے ممالک میں لوگوں کی ریاستی امور میں شرکت کے عملی مظاہر ایک جیسے نہیں ہیں۔ ذیل میں ہم ان تین تجاویز کی تفصیل دے رہے ہیں جن کے ذریعے مغربی ممالک کو مشورے دیے گئے ہیں کہ وہ کس قسم کی دلیل کا سہارا لے کر مشرق وسطیٰ میں حقوق انسانی اور جمہوریت کی ترویج کی حمایت کرسکتے ہیں۔

بادشاہتیں

مغربی ممالک کی طرف سے ایک طرز عمل تو یہ ہوسکتا ہے کہ وہ برسر اقتدار بادشاہوں، سلطانوں اور شیوخ کی حمایت کریں اوور اس طرح حالات کو جوں کا توں (status quo) برقرار رہنے دیں۔ مغرب کے اس طرز عمل کی توجیح عربوں کی مخصوص سماجی روایات کی روشنی میں پیش کی جاسکتی ہے۔ وہ اس طرح کہ مغرب کے علی الرغم عالم عرب میں شخصی آزادیوں کا سرے سے وجود ہی نہیں۔ یہاں لوگ اپنے حکمرانوں کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے عادی ہیں، اس لیے مغرب اگر اسی حالت کو برقرار رہنے دے تو اس سے سلامتی کو فروغ مل سکتا ہے۔ تاہم حالت کو جوں کی توں برقرار رکھنا اب ممکن نہیں رہا کیونکہ اکثر حکمرانوں نے معمولی سہی لیکن عظیم تر جمہوریت اور عوامی شرکت کی طرف قدم بڑھائے ہیں۔ سعودی عرب کے فرماں روا نے ۱۹۹۲ء میں مجلس شوریٰ نامزد کی تو ایسا لوگوں میں موجود بے چینی کو بھانپتے ہوئے کیا گیا۔ اسی طرح دوسرے ممالک اس سفر میں سعودی عرب سے آگے نکل گئے ہیں اور موجودہ حالت تغیر پذیر ہے۔

موجودہ حالت اس لیے بھی برقرار رکھنا ممکن نہیں کہ اطلاعات کی ترسیل نے دنیا کو ایک گاؤں میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تبدیل کر دیا ہے جس کے نتیجے میں مشرق وسطیٰ کے لوگ خود بھی جمہوریت اور انسانی حقوق کی بات کرنے لگے ہیں۔ مغربی ممالک کے لیے بہتر طرز عمل یہ ہوگا کہ وہ بادشاہوں اور شیوخ کی بیک وقت حمایت بھی کریں اور ان پر تنقید بھی۔ وہ اس طرح کہ جہاں جمہوریت کی طرف پیش رفت ہو رہی ہے اس کی تحسین ہو لیکن جہاں جہاں انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں ہو رہی ہوں وہاں کڑی تنقید اور محاسبہ بھی ہو۔

مساجد

جیسا اوپر ذکر ہوا حقیقت تو یہ ہے کہ بادشاہوں اور شیوخ کی حمایت سے جمہوریت اور حقوق انسانی کو فروغ ملنا محال ہے۔ پھر کیا یہ تجویز دی جا سکتی ہے کہ مغربی ممالک اسلامی بنیاد پرستوں کی حمایت کریں جنہوں نے مشرق وسطیٰ میں بے چینی کی آوازیں بلند کرنا شروع کر دی ہیں؟ چونکہ خطے میں عمومی طور پر سیاسی جماعتوں کو کام کرنے نہیں دیا جا رہا اس لیے زیادہ تبدیلی کی آوازیں یہی مذہبی گروہ بلند کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ دہشت گرد تنظیمیں مثلاً فلسطینی حماس، مصر کی جماعۃ الاسلامیہ اور الجزائر کی اسلامی فوج کی کارروائیاں ذرائع ابلاغ پر آ رہی ہیں لیکن مغرب کو یاد رکھنا چاہیے کہ بنیاد پرستوں کی اکثریت امن پسند ہے جو ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کے لیے کوشاں ہیں جہاں قرآن طاقت کا سرچشمہ ہو۔

یہاں ممتاز احمد اور ولیم زارٹمین* (William Zartman) کا تحقیقی مطالعہ خالی از دلچسپی نہیں جنہوں نے رائے دی ہے کہ اگر مخالف مسلم گروہوں کو اقتدار میں شریک کیا جائے تو وہ بہت سارے امور پر مصلحت کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ ملائیشیا کی مسلم یوتھ موومنٹ سیکولر اقتدار کی حامل UMNO سے اتحاد کی صورت میں کئی اسلامی منصوبوں کو ترک کر چکی ہے۔ اس طرح کا واقعہ ۱۹۸۰ء میں تیونس میں بھی رونما ہوا جب اسلامی رجحان تحریک (Islamic Tendency Movement) نے دیگر سیاسی جماعتوں کے ساتھ اشتراک کیا۔

اسلامی بنیاد پرستوں کی حمایت کے لیے مختصر المیعاد اور طویل المیعاد پالیسیاں وضع کرنے کی ضرورت ہے۔ مختصر المیعاد حمایت کے نتیجے میں اگر یہ گروہ کامیاب ہوتے ہیں تو موجودہ حالت کے مقابلے

---

* Mumtaz Ahmed and William Zartman, "Political Islam: Can It Become a Loyal Opposition?", *Middle East Policy*, Vol. 5 (1997), p.72.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں اظہار خیال، جماعتی وابستگی اور خیالات کی آزادیاں زیادہ ہوں گی جب یہ آزادیاں پروان چڑھیں گی تو ایک وقت آئے گا کہ خود اسلامی بنیاد پرست تنقید کا نشانہ بنیں گے یوں آج بنیاد پرستوں کی حمایت آنے والے دنوں میں ان کے خاتمے پر منتج ہوگی۔ تاہم بنیاپرستوں کی حمایت کے ساتھ ساتھ ان پر تنقید بھی جاری رہنی چاہیے جیسا کہ ابتدائی سطحوں میں بادشاہوں اور شیوخ کی بیک وقت حمایت اور تنقید کی بات ہوئی تھی یہی طرز عمل بنیاد پرستوں کے بارے میں بھی اختیار کرنا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ مغربی ممالک جب بنیاد پرستوں کی حمایت پر کمر بستہ ہوں گے تو خود ان کے معاشروں سے سوالات اٹھیں گے۔ لوگ آیت اللہ خمینی کے دور میں امریکہ اور برطانیہ کے خلاف ایرانی بنیاد پرستی کا حوالہ دے کر اسے دہشت گردی سے منسلک کریں گے۔ وہ فلسطین میں حماس اور الجزائر کے اسلام پسندوں کی کارروائیوں کا حوالہ دیں گے۔ بہر حال یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ اسلامی بنیاد پرستوں کے حوالے سے ذرائع ابلاغ نے مبالغہ آمیزی کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ بات خوش آئند ہے کہ اب ان ذرائع ابلاغ کا رویہ مثبت طور پر بدل رہا ہے [واضح رہے کہ یہ مضمون ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء سے قبل لکھا گیا۔] اور یہ سوچ ابھر رہی ہے کہ تمام بنیاد پرست دہشت گرد نہیں۔ یہاں ہم الجزائر کے حالات کا پھر حوالہ دیں گے جہاں ۱۹۹۱ء میں فوج نے اقتدار پر قابض ہو کر اسلامی محاذ کی منتخب قیادت کو اقتدار منتقل نہیں ہونے دیا۔ جبکہ دوسری طرف اسلام پسندوں نے ردعمل کے طور پر قتل و غارت گری شروع کر دی۔ اب اس صورت حال میں مغربی ممالک کا کیا رویہ ہونا چاہیے؟ بہتر یہ ہے کہ دونوں فریقوں کے غلط طرز عمل کا محاسبہ ہو بلکہ اگر ان کے درمیان مصالحت کرا دی جائے تو مزید قتل و خون کو روکا جا سکتا ہے۔

فوجی ساز و سامان

مشرق وسطیٰ میں جمہوری عمل اور انسانی حقوق کے فروغ کے لیے تیسری مجوزہ صورت یہ ہے کہ غیر جمہوری حکومتوں پر تجارتی پابندیاں عائد کی جائیں۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ امریکہ اور برطانیہ خطے کے ممالک کو اسلحہ کی فروخت کے بڑے ذرائع ہیں اس لیے اس حوالے سے پابندیاں کارگر ثابت ہو سکتی ہیں۔ بالفرض محال اگر اس نوعیت کی پابندیاں موثر ثابت نہ بھی ہوں پھر بھی ایسا کرنے سے مغربی ممالک کو ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اخلاقی فتح ضرور حاصل ہوگی۔ حال ہی میں برطانیہ کی لیبر حکومت نے اعلان کیا ہے کہ وہ کچھ ممالک کو اسلحہ کی فروخت پر پابندیاں لگانے والی ہے۔ مجوزہ پابندی لیبر پارٹی کے اس اصول کی مظہر ہے جس کے تحت وہ ایسے ممالک کو اسلحہ فروخت نہیں کرے گی جہاں اسے اندرونی مخالفین کو کچلنے کے لیے استعمال کرنے کا اندیشہ ہو۔ (سابق) برطانوی وزیر خارجہ رابن کک نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ برطانوی حکومت خریدار ملک میں انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کی حالت پر نظر رکھے گی۔ اور اگر یہ خدشہ محسوس کیا گیا کہ اسلحہ اندرونی مخالفین کو کچلنے میں استعمال ہوگا تو اس کے لیے لائسنس جاری نہیں کیا جائے گا۔

مغربی ممالک کو ایک قدم اور آگے جا کر ان ممالک پر تجارتی پابندیاں بھی عائد کرنی چاہییں۔ لیکن اہم سوال یہ ہے کہ پابندیاں جو بظاہر متاثر کن تو نظر آتی ہیں لیکن حقوق انسانی اور جمہوریت کے فروغ میں کتنی کارگر ثابت ہوں گی؟ جیسا کہ برطانوی وزیر خارجہ نے ایک اور جگہ کہا ''ہمیں اس غلطی سے بچنا ہوگا کہ حقوق انسانی کا خیال نہ رکھنے والے ممالک سے قطع تعلق کے بعد مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں اس پالیسی سے ہماری ساکھ تو بحال ہوگی لیکن ان ممالک کے عوام کے لیے بہتر حقوق کی ضمانت نہیں بن سکتی۔ ہمیں چاہیے کہ مکالمے کے ذریعے حقوق انسانی کے معیارات کو بہتر بنائیں''۔

حاصل کلام

اب تک کی بحث سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ انسانی حقوق اور جمہوریت کے موثر فروغ کے لیے یا تو بادشاہوں اور شیوخ کی حمایت جاری رکھی جائے (خاص طور پر اُردن اور عمان میں) اور یا پھر اسلامی بنیاد پرستوں کو مدد دی جائے۔ دونوں صورتوں میں تنقید جاری رہنی چاہیے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی ایک ملک میں بادشاہ کی حمایت کے ساتھ ساتھ ایک یا زیادہ بنیاد پرست گروہوں کی بھی حمایت کی جائے (بالخصوص سعودی عرب میں)۔

درج بالا راستوں کے علاوہ مشرق وسطیٰ میں انسانی حقوق اور جمہوریت کو تقویت پہنچانے کے لیے اور بھی کئی طریقے اختیار کیے جاسکتے ہیں۔

(الف) مغربی ممالک کو مشرقِ وسطیٰ میں اظہار رائے کے تصور اجاگر کرنے والوں کی حمایت کرنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چاہیے۔ یہ کام سیکولر تنظیموں یعنی ایمنسٹی انٹرنیشنل اور عرب تنظیم برائے حقوق انسانی سے بھی لیا جا سکتا ہے۔
عرب ممالک جہاں تقریر کی آزادی میسر نہیں وہاں سیاسی مباحث کے لیے پیشہ ورانہ تنظیموں کا سہارا لیا جاتا ہے ان میں ڈاکٹروں، انجینئروں اور اساتذہ کی تنظیمیں (جیسے کویت یونیورسٹی گریجویٹ سوسائٹی، قطر جسارہ کلچرل کلب اور امارات ایسوسی ایشن آف سوشل پروفیشن) شامل ہیں۔ ان تنظیموں میں سے اکثریت پر بنیاد پرستوں کا قبضہ ہے۔ جمہوریت اور احترام حقوق انسانیت کے وسیع تر مفاد کے لیے ان تنظیموں کی حمایت کرنی چاہیے۔

(ب) مغربی ممالک کو مجلس شوریٰ جیسے اداروں کے ساتھ سنجیدہ تعلق استوار کرنا چاہیے باوجودیکہ ان کی اپنی حکومتیں ان سے بے اعتنائی برتتی ہوں۔

(ج) ہمیں ایسے مواقع تلاش کرنے چاہیں کہ مغربی حکام ان ممالک کے سیاسی کارکنان سے ملیں اور ان کے خیالات بالمشافہ سنیں۔

(د) ہمیں مشرق وسطیٰ میں جمہوریت کے فروغ کی ہر کوشش کی حمایت کرنی چاہیے خواہ یہ کوشش جزوی اور غیر یقینی سمت کی طرف کیوں نہ ہو۔

حقوق انسانی اور جمہوری عمل کا فروغ راتوں رات ممکن نہیں درست سمت میں حرکت آہستہ اور تدریجی ہونی چاہیے۔ صرف یہی طریقہ لوگوں کے لیے قابل قبول ہوسکتا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں جمہوریت عرب طریق کار کے مطابق بحال ہوگی ہمیں یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ یہ لازماً امریکی یا یورپی طرز پر ہو گی۔ مشرق وسطیٰ اور دیگر ممالک میں فروغ جمہوریت کی کوششوں میں اپنا وزن کس کے پلڑے میں ڈالا جائے یہ فیصلہ حقیقت پسند سیاسی سمجھ بوجھ کے مطابق ہونا چاہیے۔

[David G. Kibble, "Monarchs, Mosques, and Military Hardware: A Pragmatic Approach to the Promotion of Human Rights and Democracy in the Middle East", *Comparative Strategy*, Vol. 17, Oct-Dec. 1998, pp.381-391]

© rasailojaraid.com